ماهنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

JAN. FEB. — 1990

جامعۃ الفلاح کی ایک اہم گزارش

ملک کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الفلاح (بلریا گنج اعظم گڑھ) میں طلباء اور طالبات کی تعداد اب چار ہزار سے بھی تجاوز کر رہی ہے جن کے لیے جامعہ کی موجودہ عمارتیں بالکل کفایت نہیں کر سکتیں۔ درسگاہوں کی بھی شدید قلت کا سامنا ہے اور قیام گاہوں کی بھی۔ اس قلت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نئی عمارتوں کی تعمیر از حد ضروری ہے۔ اس تعمیر کے لئے ضرورت کے مطابق زمین بحمد اللہ حاصل کی جا چکی ہے۔ عمارات کا نقشہ بھی ماہرین سے بنوا لیا گیا ہے۔ اس پورے تعمیری منصوبے کے لیے مصارف کا تخمینہ کم و بیش سوا کروڑ روپے ہے۔ اس رقم کی فراہمی کے لیے مختلف رقموں کے کوپن چھپوائے گئے ہیں۔

دین و ملت کے خیر خواہوں اور جامعہ کے مخلصین سے پرزور گزارش ہے کہ جب ہمارے نمائندے آپ کی خدمت میں پہنچیں تو زائد سے زائد کوپن خرید کر اس اہم دینی کام میں تعاون فرمائیں۔

نوٹ۔ جن اصحاب خیر تک ہمارا کوئی نمائندہ نہ پہنچے وہ براہ کرم اپنی اعانتی رقم درج ذیل پتے پر ارسال فرما دیں۔

ناظم جامعۃ الفلاح بلریا گنج۔ ضلع اعظم گڑھ 276121

ڈرافٹ TAMIATUL FALAH BILARIAGANJ AZAMGARH کے نام بنوائیں AC/No 20001 U.B.I. BILARIGANJ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد ۵ ____________ شمارہ ۱-۲

جنوری، فروری سنہ ۱۹۹۰ء

مدیر مسئول ____________ نور محمد فلاحی

مدیر ____________ محمد اسمٰعیل فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

- سالانہ زر تعاون .... ۴۰ روپے
- خصوصی تعاون .... ۱۰۰ روپے
- غیر ممالک سے .... ۲۰ امریکی ڈالر
- فی شمارہ .... ۴ روپے
- اس شمارے کی قیمت .... ۲½ روپے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس برائے جمال پریس دہلی ...... کاتب: خالد حسن، رشید عبدالرحیم اعظمی، اظہر خاں

نقوشِ حیاتِ نو

• اداریہ

وہ قافلے کی متاعِ گراں بہا "افضل" — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۳

• بحث و نظر

اشتراکیت کا زوال — خورشید احمد ندیم — ۶۱

عہد عباسی میں طب کے عربی تراجم اور ان کے مترجمین — حکیم عبدالباری فلاحی — ۳۲

• تعلیم و تعلم

سید احمد شہید کی تفسیر سورۂ فاتحہ اور ان کا اسلوب — ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۲۳

• تصویرِ جہاں

۱۹۸۹ء ایک تاریخ ساز سال — قاضی زین العابدین — ۱۲

• یادِ رفتگاں

مولانا افضل حسین صاحب — تابش مہدی — ۵۴

• نشریات انجمن

مختصر رپورٹ انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح — جاوید اشرف فلاحی — ۵۳

• اخبارِ علمیہ — بلک محمد وسیم احمد — ۶۷

رومانی میں قرآن کا ترجمہ

• جامعہ کے لیل و نہار — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۶۹

توسیعی لکچر، انعامی مقابلہ

اداریہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

وہ قافلے کی متاعِ گراں بہا "افضل"

علامہ خمینی سے فرانس میں جلاوطنی کے زمانے میں جب پوچھا گیا کہ ایران میں جس انقلاب کی بات آپ کرتے ہیں، کیا یہ ممکن بھی ہے؟ یہ آئیگا کیسے؟ انھوں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا "یہ انقلاب ان نوجوانوں کے ہاتھوں آئیگا جو آج اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹے دودھ پی رہے ہیں اور جنھیں ان کی مائیں لوریاں دے رہی ہیں"۔ ایران کے یہ شیر خوار بچے پلتے، بڑھتے اور جوان ہوتے رہے اور خمینی کی تقریروں کے کیسٹ سنتے، ان کے پیغام کو سمجھتے اور اسے سینے سے لگاتے رہے، پھر ایران میں وہ تاریخی انقلاب آیا اور دنیا نے دیکھا کہ رضا شاہ پہلوی کے جمے جمائے مستحکم نظام حکومت کو زیر و زبر کرنے اور الٹ دینے والے یہی سرکف نوجوان تھے جنھیں ان کی مائیں خمینی کے اس جواب کے وقت اپنی آغوش محبت میں لوریاں دے رہی تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کا مستقبل اس کے بچے ہی ہوا کرتے ہیں، جیسے بچے ہونگے، جیسی ان کی تربیت ہوگی اور جیسے ان کے مربی ہونگے ویسا ہی اس قوم کا مستقبل ہوگا، بچوں کو بنانا سنوارنا، ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرنا، انکی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا اور انھیں تابناک اور روشن مستقبل کیلئے تیار کرنا ہی دراصل قوم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

ہمارے نزدیک تیم محترم مولانا جناب افضل حسین صاحب مرحوم کی سب

سے بڑی خدمت اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے بچوں پر احسان کرکے ملت پر احسان کیا۔ مولانا مودودی علیہ الرحمۃ کے پیش نظر جو اسلامی انقلاب تھا وہ انقلاب ہر شعبۂ زندگی میں مکمل تبدیلی کا طالب تھا، ملک میں رائج نظامِ تعلیم اس میں مفید ہونے کے بجائے اس کے لئے زنجیر پا تھا۔ مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے اس مقصد کے تحت نظامِ تعلیم کا ایک خاکہ بنایا تاکہ مطلوبہ اسلامی نظام کیلئے یہاں سے افراد فراہم ہوسکیں۔ انھوں نے دین و دنیا کی تفریق ختم کی۔ مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر ہو کہ انجینئر، سائنس داں، جغرافیہ داں اور ریاضی داں ہو یا شاعر و ادیب، کچھ بھی ہو، اقبال کا مومن ہو، جہاں تک میری معلومات ہیں مولانا افضل حسین صاحب مرحوم تنہا وہ فرد ہیں جنھوں نے اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی کوشش کی اور بڑی کامیاب کوشش کی، ابتدائے کار کے طور پر انھوں نے ابتدائی و ثانوی تعلیم گاہوں کیلئے نصاب کی کتابیں تیار کیں۔ مختلف زبانوں اور مختلف فنون پر خود کتابیں مرتب کیں۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح انھوں نے بچوں کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھا جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا۔ دینیات، جغرافیہ، تاریخ، حساب اور سائنس کی کتابوں کو بھی اس طرح ترتیب دیا کہ باوجودیکہ ان کا موضوع دینیات نہیں تھا لیکن ان کے پڑھنے سے اللہ کا وجود، قدرت، حکمت، رحمت وغیرہ امور غیر محسوس طریقہ سے طالب علم کے سامنے آتے اور باطل ـــــ بے نقاب ہوتا چلا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(الف) زمین کے متعلق زمین ہی کی زبان سے کہلواتے ہیں "میں کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کا صحیح علم صرف میرے خالق ہی کو ہے۔ ہاں بعض لوگوں کا گمان ہے کہ ......" کتنی صحیح بات ہے، زمین کے متعلق کوئی یقینی بات زمین کے خالق ہی کو ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد سائنسدانوں کی تحقیق کا حوالہ دیا ہے لیکن اس کی ابتدا یوں کی ہے "بعض لوگوں کا گمان ہے کہ ....." لفظ گمان اشارہ کرتا ہے کہ سائنسدانوں کی تحقیق بہرکیف کوئی ناقابلِ ترمیم اٹل اور ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔

(ب) زمین ہی کے متعلق ایک دوسری جگہ کہتے ہیں "اللہ نے زمین بنائی ...... زمین کس طرح بنی؟ یہ ہم ٹھیک نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے ہمارے پاس کوئی معتبر ذریعہ نہیں ہے ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ اللہ میاں جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں "ہوجا" اور وہ چیز ہوجاتی ہے"۔ ہمیں کچھ بنانا ہو، تو ہم ساز و سامان ڈھونڈتے ہیں۔ مگر اللہ میاں ہماری طرح محتاج نہیں ہیں۔ انھیں کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی ...... سائنس داں کہتے ہیں کہ ......" پھر تفصیل کے ساتھ سائنس والوں کی تحقیق کا ذکر ہے۔ دیکھئے کس طرح پہلے تو زمین کے متعلق ایک اصولی حقیقت ذہن نشین کرائی پھر سائنسدانوں کی تحقیق [illegible] ئے۔

(ج) سورج اور چاند پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں "زمین کی طرح چاند بھی ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ کتنی قوت والا ہے وہ اللہ جو ان سب کو گردش میں رکھتا ہے۔" آگے چل کر سورج اور چاند کے گرہن کے بارے بچوں کے ذہن نشین کراتے ہیں "تم نے چاند اور سورج میں گرہن لگتے دیکھا ہوگا۔ گرہن لگنے پر چاند اور سورج کے روشن چہرے تاریک ہوجاتے ہیں۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں ...... مگر بعض لوگوں میں گرہن کے بارے میں عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔ چاند اور سورج کو بھی وہ لوگ دیوتا سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ بعض دوسرے دیوتا جو ان کے دشمن ہیں انھیں نگلنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کتنی بے سروپا باتیں ہیں اب تو چاند پر انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں" پھر گرہن لگنے کا سبب بتانے کے بعد گفتگو اس طرح ختم کی ہے "گویا چاند گرہن دراصل چاند پر زمین کا سایہ ہے اور سورج گرہن زمین پر چاند کا سایہ ہے اور بس، نہ کہیں دیو کی ہے اور نہ کوئی دیوتا۔"

(د) ایک قوم کیوں مٹتی اور دوسری قوم کیوں اس کی جگہ لیتی ہے، اس کا صحیح فلسفہ ولاوجوں کی بحث میں یوں کرتے ہیں "جب انھیں فارغ البالی نصیب ہوئی تو یہ لوگ شکرگزار بندے بن کر رہنے کے بجائے اللہ سے بغاوت کرنے لگے ..

خلاف بستیوں کو اس کا شریک ٹھہرایا...... امراء اور حکومت کے ذمہ دار عیش و عشرت میں پھنس گئے، اللہ کی مرضی پر چلنے کے بجائے اپنی پسند کے قاعدے قانون گھڑ لئے...... اور خود کاہل آرام طلب ہوگئے۔ اب ان کی صلاحیتیں مفید اور بناؤ کے کاموں پر خرچ ہونے کے بجائے صرف بگاڑ کے کاموں پر خرچ ہونے لگیں...... تو اللہ نے اس ملک کا انتظام ان سے چھین کر آریہ نام کی ایک بیرونی قوم کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا...... (بالآخر آریوں کے ہاتھوں) دراوڑوں کے عالی شان محلوں اور مضبوط قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔"

(ہ) تاریخ اپنے سینے میں رطب و یابس سب کچھ سمیٹ رکھا ہے، کن تاریخی واقعات کی کیا اہمیت ہے، بڑے خوبصورت انداز میں غیر محسوس طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرکے گزر گئے ہیں۔ ایک سبق کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ "رامائن کی کہانی" اور ایک دوسرے سبق کا عنوان "مہابھارت کی کہانی"۔ ذرا غور کیجئے رامائن و مہابھارت کیلئے لفظِ کہانی یہ تصور دیتا ہے کہ ان کی حیثیت صرف قصہ کہانی کی ہے۔

(و) ریاضی گرچہ دلچسپ موضوع ہے لیکن ایک شخص کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ اس میں موصوف کا وہ انقلابی مقصد ساتھ نہیں دے سکا ہوگا۔ لیکن یہاں بھی ان کا ذہن خوب چلا ہے۔ ایک طرف تو عشر، نصف عشر، زکوٰۃ اور ترکہ کی تقسیم وغیرہ امور بھی چھوٹنے نہیں پائے ہیں، دوسری جانب ان کی مشقوں میں تیر اور شیر جیسی چیزوں کے بجائے انسانیت اور اس کی اعلیٰ قدریں آپ دیکھیں گے۔ بعض سوالات کے انداز دیکھئے۔

"ایک اسکول کے ۵۹۶ لڑکوں نے اپنے غریب ساتھیوں کی امداد کیلئے ۲۵ر پیسے کے حساب سے جمع کیے، بتاؤ انھوں نے کتنے روپے جمع کر لئے؟" "ایک سلائی کی مشین ۲۲۵ر روپے ۵۰ پیسے کی ملتی ہے ایسی مشینیں اٹھارہ بیوہ عورتوں کو دینے کے لئے کتنا روپیہ خرچ کرنا ہوگا؟" "بدر کی لڑائی میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی

جبکہ کافر ۱۰۰۰ تھے اور مسلمان صرف ۳۱۳، بتاؤ مسلمانوں سے کافر کتنا زیادہ تھے؟"
"ایک شخص مرتے وقت اپنی بیوی کے علاوہ ۵ لڑکے اور ۴ لڑکیاں اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے اگر وہ اپنی جائداد کے ۱/۳ حصہ کے بارے میں وصیت کر چکا ہو تو اس کی ....۲۸۰ر روپے کی بقیہ جائداد کس طرح تقسیم ہوگی اور ہر ایک کے حصہ میں کتنی رقم آئے گی؟ (بیوی کا حصہ ۱/۸ اور لڑکے کا حصہ = لڑکی کے حصہ کا دوگنا)"

(ز) اردو زبان اور دینیات کی جو کتابیں ہیں، قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا کیا رنگ ہوگا، قدم قدم پر نصب العین کی جھلک نظر آئے گی۔ "ہمارے کتاب قاعدہ" میں آپ دیکھیں گے۔"

ایک دو تین ــــ قائم کر دو دین
تین دو ایک ــــ بن جاؤ نیک

اور ــــ کون ہے مالک، کون ہے آقا ــــ کون ہے حاکم، کون ہے راجا
بولو بچو! اللہ اللہ

ہماری کتاب اول میں ــ

کون کھلاتا، کون پلاتا ــــ اللہ اللہ
کون مارتا، کون جلاتا ــــ اللہ اللہ

ہماری کتاب سوم میں ایک سبق "مکڑی کا گھر" ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مکڑی کا گھر، اس کا جالا، کتنا کمزور ہوتا ہے، مکڑی خود اس پر بھروسہ نہیں کرتی، خاتمہ اس طرح کیا گیا ہے "مگر ذرا ان نادانوں کو دیکھو، جو اللہ کے سوا کسی دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، اور مصائب و آلام میں کسی اور ہستی کا سہارا تلاش کرتے ہیں، اللہ کے مقابلے میں دوسرے سہارے کتنے کمزور ہیں، مکڑی کے گھر سے بھی زیادہ کمزور...." ہماری کتاب چہارم میں "پل" ایک سبق ہے، دنیا کے پلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی کے ساتھ آخرت کے پل، پل صراط سے گزرنے کی تیاری کی ضرورت کا احساس دلایا ہے، یہی حال ہندی کی کتاب "ہماری پوتھی" کا ہے۔ اس میں بھی یہ ساری خوبیاں

نظر آئیں گی۔ اس کا معیار اتنا اچھا ہے کہ اس کو پڑھ لینے کے بعد طالبعلم کی استعداد اتنی اچھی ہو جاتی ہے کہ اسی معیار کی دوسری کتاب پڑھنے والا کوئی طالبعلم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں دینیات کو سردست چھوڑتا ہوں کہ اس کا موضوع ہی الگ ہے۔

اس پورے کورس کا ادب اتنا پیارا اور شگفتہ ہے کہ بس پڑھتے جائیے اور اس کی مٹھاس سے محظوظ ہوتے اور عطر بیزی کا سے جھومتے جائیے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کا جائزہ لینا ممکن ہی نہیں ہے اس لئے اس پہلو پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس پورے کورس کا اسلوب بیان اور طرز تحریر، قصے اور مثالیں سبھی، سطحیت، بازاری پن اور بے حیائی سے پاک، انتہائی مہذب، جاذب نظر، پاکیزہ اور شائستہ، نیز اعلیٰ انسانی قدروں کی آئینہ دار ہیں۔ عصر حاضر کی دیگر نصابی کتابوں کے موازنے سے انکی شگفتگی اور دوبالا ہوتی اور ان کا حسن اور نکھرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے لکھنے اور مزید اس رخ پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مرحوم نے اس دائرے میں جو کام کیا، وہ ایک پوری اکیڈمی کے کرنے کا کام تھا۔ اس پر انھیں جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

یہ ایسا نصاب ہے جس نے اپنے مخالفین سے بھی اپنی برتری تسلیم کرائی اور اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ اگر مرحوم کو اس شعبہ میں رہ کر مزید کام کرنے کا موقع ملا ہوتا تو یہ عمل جو ہمیشہ تجدید در تجدید کا طالب ہوتا ہے، تعطل و جمود کا شکار نہ ہوتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، نئے حالات و ضروریات اور مسائل کے تقاضے، جغرافیائی حدود کی تبدیلی اور سائنسی علوم کے ارتقا کے پیش نظر اس نصاب کی بعض کتابوں پر نظر ثانی کی ضرورت تھی اور یہ کام شروع بھی ہو گیا ہے لیکن یہ اتنا جامع اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے لئے ایک پورے بورڈ اور اکیڈمی کی ضرورت ہے۔ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں، ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں جو تنہا یہ سب کام کر سکیں۔

جماعت کی قائم کردہ مرکزی درسگاہ اسلامی جو پہلے ملیح آباد میں تھی اور اب

رام پور میں ہے آپ کی نظامت کے دور تک خوب پھلی پھولی اور برگ و بار لائی۔

جامعۃ الفلاح سے مولانا مرحوم کا روز اول ہی سے بڑا قریبی اور قلبی تعلق رہا ہے۔ اس کی مجلس تعلیمی کے شروع سے ممبر تھے۔ اس کے اجلاس میں پابندی سے آتے اور اس کے نصاب کی ترتیب و تشکیل اور اس کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لیتے۔ ۱۹۶۳ء میں جامعہ میں اساتذہ کی تربیت و تدریب کے لئے ایک کیمپ لگا تھا۔ مرحوم اس میں مربی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اور بڑے قیمتی لکچر دیئے تھے۔ بعد میں انھیں لکچروں اور نوٹس کی روشنی میں ایک بے نظیر کتاب "فن تعلیم و تربیت" منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا اصل کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس فن کو صحیح رخ دیا۔ اسلامی روح کے مطابق اس کی تہذیب اور تراش خراش کی قرآن و حدیث سے عصر حاضر کے مروجہ نقطۂ نظر کا موازنہ کیا اور یہ کہنا چاہئے کہ اس فن کو انھوں نے اسلامیا دیا ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ نہ صرف استاد کے پاس رہے بلکہ ہر ماں اور باپ کے پاس ہونی چاہئے۔

قیم مرحوم کو جامعہ کی طالبعلمی کے زمانہ ہی سے میں نے نرم مزاج، خوش اخلاق اور سادہ انسان پایا۔ بچوں کی حوصلہ کو بڑھانے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ کہتے طالبعلم کو نمبر دینے کے معاملہ میں اساتذہ کو پوری فراخ دلی کا ثبوت دینا چاہئے۔ مرکزی درسگاہ یا مرکز جماعت میں ان کے ساتھ رہنے والے ان کی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے مداح اور ثنا خواں ہیں۔ میرے ذہن میں متعدد واقعات گھوم رہے ہیں لیکن اس پر قلم اٹھانا انہی کا حق ہے میں اسے ان کے لئے چھوڑتا ہوں۔

گزشتہ سال دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں شرکت کیلئے مرکز جماعت سے مولانا سراج الحسن صاحب کے ہمراہ ندوہ تشریف لائے تھے۔ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے ساتھ جامعہ سے شریک ہوا تھا۔ کئی روز ایک کمرہ میں ساتھ رہنا ہوا۔ کسے خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہوگی۔ اس وقت انھیں دیکھکر کوئی

محسوس نہیں کرسکتا تھا کہ اتنی جلد بلاوا آجائے گا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

جاتے ہی گلستاں سے ترے فصل بہار!
پامال ہر روش ہے تو ہر پھول سوگوار۔

ادھر کچھ عرصہ سے ہماری اہم اور بزرگ شخصیتیں ایک ایک کرکے ہم سے رخصت ہورہی ہیں اور ہمارے درمیان خلا کے بعد خلا پیدا ہوتا جارہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں ہماری واقعی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ کیا صرف یہ کہ ہم کچھ تعزیتی جلسے کریں۔ کچھ قراردادیں پاس کرلیں، کچھ بیانات دے دیں، کوئی مضمون لکھ دیں اور کوئی مخصوص نمبر نکال دیں اور بس، یا ان سے الگ ہٹ کر کچھ اور بھی ہم پر عائد ہوتا ہے؟ ہمیں اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ رخصت ہونے والے اپنے عمل کا توشہ ساتھ لے کر رخصت ہوگئے، ہمیں اپنے لئے توشۂ سفر تیار کرنا اور سوچنا ہے کہ ہم اس خلا کو کس طرح پُر کرسکتے ہیں، اس میں ہمارا کیا کردار ہوسکتا ہے۔ دراصل کرنے کا کام یہی ہے اور یہی حقیقت میں ان سے صحیح معنوں میں محبت اور انھیں بہترین خراج عقیدت ہے۔ مگر افسوس، اسی میں ہمارا جی نہیں لگتا!!

زندہ قومیں کاسۂ گدائی لے کر زندگی کی بھیک نہیں مانگا کرتیں، وہ اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتی ہیں، انھیں رونا نہیں آتا، وہ ماتم کناں ہونا اور سینہ کوبی کرنا نہیں جانتیں۔ ان کا بچہ بچہ حوصلوں اور امنگوں سے معمور اور لیاقتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ انھیں افراد کی کمی کی شکایت نہیں ہوتی، وہ قحط الرجال کا شکار نہیں ہوتیں، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ ایک جگہ خالی ہوتی ہے تو دس اس کی جگہ پُر کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، ایک حماسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

وليس يهلك منّا سيّدٌ أبدًا   إلّا افتلينا غلامًا سيّدًا فينا

(جب کبھی ہمارا کوئی سردار ہلاکت سے دوچار ہوتا ہے اس کی جگہ لینے کے لئے ایک دوسرا تیار رہتا ہے)

محنت کے لئے انھیں قربانیاں دینی پڑتی ہیں، اور اپنے خونِ جگر کو جلانا اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عزت و اقبال آگے بڑھ کر ان کے قدم چومتے اور زندگی کے اسٹیج ان کے لئے خالی کردیئے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس جب وہ کھوکھلی ہوجاتی ہیں، ان کے اندر سے روحِ حیات نکل جاتی اور وہ لاشۂ بے جان ہوجاتی ہیں تو پھر ذلت و رسوائی ان کا مقدر بن جاتی ہے، آہ و فغاں کرنا، سر پیٹنا، مرثیے لکھنا اور مرثیے پڑھنا ان کا شیوہ ہوجاتا ہے۔

کیا ہم بھی ایک ایسے ہی صرف رونے اور رلانے کے دور سے تو نہیں گزر رہے ہیں کہ جس میں ہم پاتے کم اور کھوتے زیادہ ہیں۔ ہمارے یہاں جو جگہ خالی ہوتی ہے پُر ہوتی دکھائی نہیں دیتی اور جو شخصیت اٹھ جاتی ہے اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ جاتی ہے۔

قیم محترم مولانا جناب محمد افضل حسین صاحب مرحوم۔ جنھیں مرحوم کہتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ کی ہم سے جدائی تحریک اسلامی اور ملت اسلامیہ ہند کا ایک ایسا زخم ہے جو مندمل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ جامعہ ہمارے مقدس ارمانوں اور پاکیزہ امیدوں کا مرکز، جس کی خشتِ اوّل جذبۂ اقامتِ دین، جس کی روح فقہی و مسلکی عصبیتوں سے بالاتری اور جس کا مزاج قدیم و جدید میں توازن ہے، کیا یہ جامعہ اس گہرے زخم کے لئے مرہم فراہم کرسکتی ہے؟ انتظار ہے، انتظار!!

جناب محمد رفیق صاحب ہمارے بہترین کاتب تھے، کئی ماہ ہوئے، انھوں نے گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے کتابت مکمل طور سے چھوڑ دی ہے۔ انھوں نے اپنی علالت کے باوجود ایک عرصہ تک ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ ہم موصوف کے شکر گزار ہیں ہمیں اب تک کوئی باقاعدہ کاتب نہیں مل سکا ہے جس کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہے وقت پر کتابت نہیں ہو پارہی ہے اور ہم دور دراز کے متعدد نومشق کاتبوں کی خدمات لینے پر مجبور ہیں۔ امید ہے قارئین ہماری اس مجبوری کا خیال کریں گے۔

از: قاضی زین العابدین
استاذ جامعۃ الفلاح

۱۹۸۹ء ایک تاریخ ساز سال

۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ء رات کے گیارہ بجے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد تاریخ کا ایک تاریخ ساز سال شروع ہونے والا تھا۔ میں اپنی شب و روز ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ پہلے ہی صفحہ پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی تحریر پر نظر پڑی۔

"ہم کس غرض کے لئے اٹھے ہیں"۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولاناؒ مجھ سے ہمکلام ہوں۔ آپ مجھ سے فرما رہے تھے۔ "تمہاری زندگی کا اصل مقصد اقامت دین اور شہادت حق ہے اس لئے تمہاری تمام سعی و عمل کا مرکز و محور اسی چیز کو ہونا چاہئے"۔ مولاناؒ مجھے نصیحت فرما رہے تھے "ہر اس بات اور کام سے دستکش ہو جاؤ جو اس کی ضد ہو اور جس سے اسلام کی غلط نمائندگی ہوتی ہو"۔

مولاناؒ کا چہرہ اچانک طور پر آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا لیکن انکی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں اپنی ڈائری کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا جائزہ لیا۔ واقعی میری زندگی کے ۶۶ سال بیکار گئے۔ چند لمحوں بعد میں اپنی زندگی کی ۶۷ ویں منزل میں قدم رکھنے والا تھا۔ میں اپنے آپ سے ہمکلام تھا۔ "کیا میں نے اپنی زندگی کا مقصد اقامت دین اور شہادت حق بنایا؟ کیا میں ہر اس بات اور اس کام سے دستکش ہو گیا جو اقامت دین کی ضد ہے اور جس سے اسلام کی غلط نمائندگی ہوتی ہے؟

شب و روز ڈائری کی ورق گردانی کرتے ہوئے ۱۵ اپریل ۱۹۸۹ء پر میری نظر رک گئی۔ اس روز ماہ صیام کا آٹھواں روزہ تھا۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد میرے خسر جناب میر غلام احمد حسن صاحب (سابق ایم ایل اے، رکن جماعت اسلامی) کا طویل علالت

کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۹۰ سال تھی۔ ایک سال پہلے ۹ رمضان کو میرے والد کے انتقال کے وقت مرحوم نے فرمایا تھا کہ قاضی غیاث الدین صاحب نیک آدمی تھے، ماہ رمضان کا مبارک مہینہ پایا کاش ہماری موت بھی رمضان میں آئے۔ شاید اس وقت فرشتوں نے آمین کہدیا ہو اور ایک سال کے اندر ہی مرحوم کو بھی رمضان کا مبارک مہینہ نصیب ہوا۔ مرحوم تہجد گزار تھے۔ قرآن کی دن رات تلاوت ہی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ بالعموم ہر تین دن میں ایک قرآن کی تلاوت کر لیا کرتے تھے۔

عنفوان شباب ہی میں تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں مولانا محمد علی مرحوم کے کہنے پر ذاکر حسین خاں صاحب (سابق صدر جمہوریہ ہند) اور اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور علاقہ برار میں تحریک خلافت کے روح رواں بن گئے۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں مرحوم کی فرمائش پر مولانا محمد علی نے اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی مرحوم کو علاقہ برار کا دورہ کرنے کے لئے بھیجا۔ مولانا شوکت علی مرحوم کی صدارت میں ملکاپور (ساسا) ضلع امراوتی، علاقہ برار میں ایک عظیم جلسہ منعقد ہونے جا رہا تھا۔ برٹش گورنمنٹ کا زمانہ تھا ضلع امراوتی کے انگریز کلکٹر نے امراوتی ضلع میں جلسوں اور جلوس پر پابندی عائد کر دی اور دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ اطراف واکناف سے بڑی تعداد میں لوگ جلسہ میں شرکت کرنے کیلئے آئے۔ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود جلسہ گاہ کی ضروری تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ لوگ جلسہ گاہ میں آنا شروع ہوئے۔ پولیس فورس بھی وقت پر حاضر ہو گئی۔ جلسہ بعد نماز ظہر شروع ہونے والا تھا۔ وقت مقررہ سے صرف ۳۰ منٹ پہلے اعلان کیا گیا کہ چونکہ امراوتی ضلع میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے اس لئے یہاں قصبہ کو ٹھا شیخ پور کے آم کے باغ میں جلسہ ابھی آدھے گھنٹے کے بعد شروع ہوگا کیونکہ وہ آم کا باغ جلسہ گاہ سے صرف نصف کلومیٹر کے فاصلہ پر ایوت محل ضلع میں تھا۔ جہاں دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں تھی۔ اس طرح تمام لوگ تقریباً پندرہ منٹ میں آم کے باغ میں پہنچ گئے جہاں چند لوگوں نے درختوں کے سایہ میں جلسہ گاہ پہلے ہی تیار کر رکھی

تھی، اور جلسہ ٹھیک وقت پر شروع ہوگیا۔ پولیس کے فرمان اور سپاہی دیکھتے ہی رہ گئے مرحوم کی قرأت کی سب نے تعریف کی۔

مرحوم امراوتی ضلع بورڈ کے برسہا برس تک ممبر اور چیئرمین رہے۔ آپ نے امراوتی ضلع میں اردو پرائمری اسکولوں کا جال بچھا دیا، چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں جہاں صرف دس طلبہ مہیا ہو سکتے تھے ایک ٹیچر کا اسکول کھلوا دیا۔ اس طرح آج بھی پورے ہندوستان میں امراوتی ضلع سرفہرست ہے جہاں اردو اسکولوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

۱۹۳۹ء میں مرحوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبہ سی۔ پی و برار کی مجلس قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آزادیٔ ہند کے بعد سیاست سے مرحوم نے کنارہ کشی اختیار کر لی کیونکہ علاقہ برار سے مسلم لیگ توڑ دی گئی تھی۔ اس کے بعد آپ جماعت اسلامی ہند کے رکن بن گئے اور مجلس نمائندگان کے بھی آپ کئی سال تک رکن رہے۔ جامعۃ الفلاح میں جب کبھی مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب ناظم جامعہ اور امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث صاحب (سابق ناظم جامعہ) تشریف لاتے تو مجھ سے مرحوم کی صحت کے بارے میں اکثر دریافت کرتے رہتے اس طرح مرحوم کا داماد ہونے کی وجہ سے ان دونوں بزرگوں کی نظر کرم مجھ پر ہمیشہ رہی ہے۔ مرحوم کی نماز جنازہ پڑھانے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ حضرت قبلہ احمد حسن صاحب مرحوم کے کردار کا خلاصہ اس شعر میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

مدت سے کوئی مرد مجاہد نہیں ملا
عالم ملے، فقیہہ ملے، صوفیا ملے

شب روز ڈائری کی ورق گردانی جاری تھی اور میں مرحوم کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری ٹائم پیس نے آواز دی اور اپنے الارم سے مجھے چونکا دیا۔ گویا کہ وہ کہہ رہی ہو کہ ۱۹۸۹ء گزر چکا اور مرحوم تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ میں ابھی بھی سوچ رہا تھا کہ مرحوم نے آزادیٔ ہند کے بعد چار مرتبہ ناگپور سنٹرل جیل میں نظربندی کی زندگی بھی گزاری ہے لیکن آپ کے پائے استقامت میں جنبش نہیں آئی۔ الارم ابھی

بج رہا تھا میں نے اپنے کمرہ کی کھڑکی کھول کر آسمان کی طرف باہر دیکھا۔ کہرے کی چادر نے رات کی تاریکی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ میرے کمرہ سے متصل ہی قبرستان ہے۔ میرے کمرہ کی کھڑکی کے سامنے ہی مولانا جلیل احسن ؒ کی قبر ہے۔ قبرستان اور قبروں کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ بھاگلپور کے فسادات میں مسلمانوں کی بے شمار لاشیں بے گور و کفن دریا میں بہا دی گئیں یا کنوؤں میں ڈال دی گئیں یا مسجد کے صحن اور گھروں میں جلا دی گئیں۔ شاید غالب نے اسی لئے کہا ہو ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

میں سوچ رہا تھا کہ یہ گردش لیل و نہار صرف دن، تاریخ، مہینے اور سال ہی نہیں بدلتی بلکہ اپنے جلو میں ملکوں، قوموں اور فرد کی قسمتیں بدلنے کا پہلو بھی رکھتی ہے۔ ۳۱ دسمبر کی نصف رات گزر چکی تھی۔ عیسوی کیلنڈر کے مطابق اہم اور دور رس تبدیلیوں کا سال ۱۹۸۹ء گزر چکا اور نئے سال ۱۹۹۰ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ عرصہ تک روسی فوجیں افغانستان کے مجاہدین سے زور آزمائی کرنے کے بعد اسی سال ۱۹۸۹ء میں افغانستان سے واپس ہو گئیں اور خود روس کی سپریم سوویت پارلیمنٹ نے افغانستان میں روسی فوجیں بھیجنے کی مذمت کی۔

روسی فوجیوں کی افغانستان سے یہ واپسی نہیں بلکہ پسپائی تھی۔ روس جیسی کسی بڑی فوج اور طاقتور ملک کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اللہ کے نام پر معمولی ہتھیاروں سے برسرپیکار مجاہدین سے شکست کھا کر وہاں سے بھاگا۔ ان مجاہدین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد تھی کہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی کے مترادف ان مجاہدین نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔

اسی ۱۹۸۹ء نے وہ منظر بھی دکھا دیا کہ ۲۸ سال پہلے بنائی گئی دیوار برلن میں دروازے کھول دیئے گئے۔ مشرقی جرمنی جو روس کے زیر تسلط تھا وہاں کے باشندے بے تحاشا مغربی جرمنی کے شہروں میں جانے لگے۔ وہ ایسے بھاگ رہے تھے جیسے جیل سے قیدی بھاگ رہے ہوں۔ کمیونزم کا آہنی پردہ ٹوٹ چکا تھا۔ انسان کی آزادی اس کا بنیادی حق ہے لہٰذا اس کا

اس سے بہتر ثبوت نہیں مہیا کیا جا سکتا کہ کسی مہذب معاشرے میں بجائے سوشلزم پر زور دینے کے انسانی حقوق کا خیال رکھا جائے۔ ۴۰ سال کے بعد اب وقت آیا ہے کہ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کے معاشرے کے تمام مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ عوام کی مرضی جاننا سب سے بڑی اہمیت کا مسئلہ ہے۔

دیوار برلن کا کھول جانا اس غیر فطری نظام کی ناکامی کی ایسی شہادت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مشرقی یورپ کے دیگر کئی ممالک میں کمیونزم کے خلاف بغاوت اور تحریک آزادی اور جمہوری نظام نے یہ ثابت کر دیا کہ غیر فطری نظام و ضابطے بندوق کی نال پر چند دن تو چلائے جا سکتے ہیں لیکن بعد میں شکست کا منہ دیکھنا ہی پڑے گا۔

پولینڈ، مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ، ہنگری، لیتھوینیا، بلغاریہ اور رومانیہ الغرض کمیونسٹ دنیا میں تبدیلی کی ہوا نے ۱۹۸۹ء میں جو طوفانی شکل اختیار کر لی ہے اس کا سب سے زیادہ اثر رومانیہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رومانیہ کی تبدیلی کو ہم "فرد کی خدائی" کے خاتمے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس انقلاب کو لانے میں دس دن کے اندر اندازاً ۶۰ ہزار افراد ہلاک ہو گئے لیکن انقلاب کو روکا نہیں جا سکا۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ گورباچوف کے عہد اقتدار میں کشادہ ذہنیت اور جمہوریت سوویت یونین کی سیاست کا ایک اہم حصہ رہا ہے اس لئے ہم گورباچوف کو ۱۹۸۹ء کا اہم ترین شخص قرار دے سکتے ہیں۔

مشرقی یورپ کے علاوہ روس کے آذربائیجان علاقوں میں بھی آزادی کی لہر اٹھی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی پرانی مسجدوں کو دوبارہ آباد کرنا شروع کر دیا ہے اور اب روسی مسلمان جاگ رہے ہیں، اور اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

روس کے علاوہ چین میں بھی جمہوریت کے حق میں اور سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۹ء کے یہ ایسے واقعات ہیں جو شاید ہی کبھی فراموش کئے جا سکیں گے

میں ۔۔۔ ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر ۲۶ نومبر ۱۹۸۹ء پر آ کر

رک گئی۔ ہمارے سابق وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی صاحب اپنی قیادت میں بھارت کو اکیسویں صدی میں لیجانے کا پلان بنا رہے تھے لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا ۲۶ نومبر ۱۹۸۹ء کو پارلیمنٹ کے انتخابات میں زبردست شکست ہو جانے کے بعد انہیں اپنی سرکار کا استعفیٰ دینا پڑا۔ اسی دن انہیں کانگریس آئی پارلیمنٹ پارٹی کا لیڈر چنا گیا اور اب وہ حزب اقتدار سے ہٹ کر اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں کام کریں گے۔

میں ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر ۲ دسمبر ۱۹۸۹ء پر آ کر رک گئی تو محاذ کے ممتاز رہنما چندر شیکھر کو دلفریب دھوکہ دے کر محاذ کے نیتا جناب وی۔ پی۔ سنگھ بھارت کے نئے وزیر اعظم مقرر ہو گئے اور دیوی لال نائب وزیر اعظم بن بیٹھے۔

اسی کے ساتھ چند صوبوں میں بھی نمایاں تبدیلیاں عمل میں آئیں یوپی کی اسمبلی پر جنتا دل نے قبضہ کر لیا اور ادھر کرناٹک اور آندھرا پردیش میں کانگریس آئی نے اقتدار سنبھال لیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مغربی بنگال کو چھوڑ کر مرکز اور ریاستوں کی برسر اقتدار پارٹیوں کو عوام نے اقتدار سے محروم کر دیا ہے۔ اس طرح ۱۹۸۹ء میں نہرو خاندان کی حکمرانی کا دور ختم ہو گیا۔

کسی جمہوری ملک میں اقتدار کی تبدیلی جمہوریت کی ایک صحتمند علامت ہے۔ ایک ہی پارٹی کے ہاتھ میں برسہا برس تک اقتدار کی باگ ڈور رہی تو اس سے یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس ملک اس پارٹی یا اس پارٹی کے لیڈر کو پسند کریں یا نہ کریں ان کے مسائل حل ہوں یا نہ ہوں ان کو اسی کے زیر اقتدار میں رہنا ہے۔ ایسی اجارہ داری کی شکل میں اس جمہوری حکومت اور حکمران جماعت میں وہ سب خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو موروثی سلطنتوں اور حکمران خاندانوں میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ بالآخر ان کے خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا اور دوسرے خاندان برسر اقتدار آ گئے۔ راجیو گاندھی نہرو اور اندرا گاندھی کے تخت نشین جانشین تھے۔ اب وہ عوام کی نظروں میں سرخرو نہیں رہے۔ بوفورس توپوں میں دلالی حاصل کرنے والوں کے نام منظر عام پر جلد آنے والے ہیں۔ تحقیقات کا سلسلہ از سر نو شروع

سنہ ۱۹۸۹ء وہ یادگار تاریخ ہے جس دن روبیہ کے اغوا کا ڈرامہ ختم ہوا۔ ڈاکٹر روبیہ سعید کو سنہ ۱۹۸۹ء نے جاتے جاتے گوشۂ گمنامی سے نکال کر بین الاقوامی افق پر جلوہ گر کر دیا۔

راجیو گاندھی کو روبیہ کے اغوا نے ایک موقعہ فراہم کر دیا۔ انھوں نے مرکزی حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے کشمیر کی حکومت پر زور ڈالا کہ وہ روبیہ کے عوض پانچ خطرناک دہشت گردوں کو رہا کر دے۔ راجیو گاندھی نے یہ بھی کہا اگر انکی بیٹی کا اغوا ہوتا تو ایک باپ کے ناطے انھیں دکھ ضرور ہوتا لیکن ملک کے وزیر اعظم ہونے کے ناطے وہ پانچ دہشت گردوں کو رہا کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوتے بلکہ وہ اپنی بیٹی کو ملک و قوم پر بلیدان کر دیتے۔

لیکن راجیو گاندھی سمجھتے ہیں کہ عوام کا حافظہ کمزور ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی کو یہ ڈر تھا کہ پنجاب کے دہشت گرد سکھ انکے بچوں کا اغوا کر کے انھیں قتل نہ کر دیں۔ اس لئے وہ کئی دن تک اپنے بچوں کے ہمراہ لال قلعہ میں قلعہ بند رہے اور اس کے بعد کسی کو نہ معلوم ہوتے ہوئے اپنے بچوں کو روس بھجوا دیا کہ وہ روس میں تعلیم حاصل کریں۔ اس میں ان کا منشا یہ تھا کہ روس کا آہنی پردہ سکھ دہشت گردوں سے ان کے بچوں کی حفاظت کرے گا۔

حکومتِ ہند نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ صرف سنہ ۱۹۸۹ء کے ایک سال کے دوران کشمیر میں ۱۴۰ مرتبہ ان دہشت گردوں نے پولیس، نیم فوجی دستوں اور فوجیوں پر حملہ کیا اور ان کے ۱۳۵ سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ پندرہ تنظیمیں کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے کام کر رہی ہیں۔ کشمیری حکومت کی پولیس اور افسران بے بس دکھائی دیتے ہیں اور حکومت خاموش ہے۔ کشمیر کے عوام اپنے جنگجو بیٹوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

حکومتِ ہند کی سی آر پی معصوم عوام کو گولیاں مار کر ہلاک کر رہی ہے۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہو رہا ہے جیسا کہ پنجاب میں معصوم اور بے گناہ نوجوان سکھوں کو سی آر پی نے گولیوں کا نشانہ بنایا تاکہ عوام میں خوف و ہراس پیدا ہو اور پنجاب کے لوگ اپنے جوان بیٹوں کو دہشت گردی سے روکیں۔

کشمیر میں کشمیر کے عوام کے خاص نمائندوں کا ہندوستانی جمہوریت اور کشمیر کی کٹھ پتلی حکو

ہو چکا ہے۔ مرکزی حکومت کی سکریٹیریٹ کی اہم فائلوں میں سے بعض اہم کاغذات غائب کر دیئے گئے ہیں۔ متعلقہ افسروں کے خلاف سخت کارروائی ہونے کا امکان ہے۔ جن کے پاس یہ فائلیں تھیں۔

میں راجیو گاندھی کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور میری نظر شب و روز ڈائری کے ورق پر تھی۔ بالآخر ۸ر دسمبر سنہ ۱۹۸۹ء پر نظر رک گئی۔

ابھی ۲ر دسمبر سنہ ۱۹۸۹ء کو جنتا دل دلی کے سنگھاسن پر بیٹھ کر اپنی تخت نشینی کی خوشیاں منا رہی تھی کہ ۸ر دسمبر کو وزیر داخلہ مفتی محمد سعید صاحب کی دخترِ نیک اختر ڈاکٹر روبیہ سعید کو کشمیر کے مجاہدین نے جنھیں حکومتِ ہند دہشت گرد کہہ کر پکارتی ہے، اغوا کر لیا۔ مجاہدین نے حکومتِ کشمیر سے مطالبہ کیا کہ ان کے پانچ لیڈروں کو جیل سے رہا کر دیا جائے ورنہ ڈاکٹر روبیہ سعید کو گولی مار دی جائے گی۔ مفتی سعید سرینگر پہنچے اور حکومتِ کشمیر پر زور دیا کہ وہ کسی طرح ان کی بیٹی کو رہا کرائیں۔ پانچ دن تک مسلسل مجاہدین اور حکومتِ کشمیر کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا بالآخر ۱۳ر دسمبر کو مجاہدین کے پانچوں لیڈروں کو رہا کر دیا گیا اسکے ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر روبیہ کو آزاد کیا گیا۔

اس طرح کشمیر کے مجاہدین نے عالمگیر سطح پر دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے ہتھیار اٹھا چکے ہیں۔ حکومتِ کشمیر کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور حکومتِ ہند کو بھی مجبوراً گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ گفتگو پانچ دن تک طول کھینچتی رہی۔ اسکی خاص وجہ یہ تھی کہ حکومتِ کشمیر ظاہری طور پر گفتگو کر رہی تھی اور اندرونی طور پر دہلی کے مشہور جاسوس روبیہ کا پتہ لگا کر اسے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے سرینگر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن انھیں روبیہ کا پتہ نہ چلا۔ اس لئے مجبوراً حکومتِ کشمیر کو مجاہدینِ کشمیر کا مطالبہ پورا کرنا پڑا۔

روبیہ کے اغوا سے مفتی محمد سعید صاحب کو ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روبیہ ہماری بیٹی اور نوجوانوں کی بہن ہے اور اس کی زندگی پانچ خطرناک دہشت گردوں سے زیادہ پیاری ہے۔ ۱۳ر دسمبر

پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔

مسلم متحدہ محاذ (M.U.F.) کے ریاستی اسمبلی کے ممبران سید علی گیلانی، محمد سعید شاہ اور غلام نبی سمجھی نے ۳۰ اگست ۱۹۸۹ء کو ریاستی اسمبلی کے اسپیکر کو ان تاریخی الفاظ میں اپنا استعفیٰ پیش کیا۔

"ہم آج مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۹ء سے بھارت سرکار اور ریاستی حکومت کی بے انتہا زیادتیوں، جذبۂ حریت اور اسلامی تشخص کو تہذیبی جارحیت کا نشانہ بنانے کی غیر جمہوری غیر آئینی اور غیر انسانی کارروائیوں کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ پیش کر رہے ہیں۔"

ہم یہاں پر استعفیٰ کے صرف ۱۹۸۹ء کے مختصر واقعات ہی پر اکتفا کریں گے۔

(۱) ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء اور ۱۵ اگست ۱۹۸۹ء کو کشمیر کے عوام کی بھاری اکثریت نے ہمہ گیر اور ہمہ جہتی ہڑتال کر کے اپنے دبے ہوئے جذبات کا کامیاب اور مثالی مظاہرہ کیا۔

(۲) ۲۵ اگست ۱۹۸۹ء کو جامع مسجد سرینگر کی بے حرمتی اور اس کے تقدس کو پامال کرنا اس بات کی زندہ مثال اور تازہ ثبوت ہے کہ بھارت کے تسلط میں مسلمانانِ جموں و کشمیر کی جان و مال، عزت و آبرو کے ساتھ ساتھ مذہبی مقامات کا تقدس اور دین و ایمان بھی محفوظ نہیں ہیں۔

جابر و ظالم پولیس جامع مسجد میں جوتوں اور بوٹوں سمیت داخل ہو گئی۔ سیکڑوں لوگوں کو یرغمال بنا لیا گیا۔

جامع مسجد کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے اور لوگوں کو زد و کوب کیا گیا۔ خوف و ہراس اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا گیا۔

(۳) ریاست جموں و کشمیر میں جیلوں میں نظربند سیکڑوں نوجوان اذیت اور تشدد کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں، ان کی جسمانی قوتوں کو مفلوج اور اعضاء مختلف عوارض کا شکار بنائے گئے ہیں، ان کے پسماندگان کو بے سہارا چھوڑ دیا گیا ہے اور ریاست کے عوام کی اکثریت کو بیسویں صدی کی بدترین اور ننگے کھڑے کر دینے والے

نظام کا شکار بنایا جا رہا ہے۔

کیا بھارت سرکار اپنے زرخرید ایجنٹوں کے ذریعہ ایک نہتی اور بے بس قوم کے جذبۂ حریت اور جذبۂ آزادی کو زور بازو دبانے میں کامیاب ہو جائے گی؟ وقت ہی اس کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔

۱۹۸۹ء راجیو گاندھی کے دور اقتدار کا بدترین سال گزرا ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں الیکشن سے کچھ پہلے بھاگلپور اور اس کے قرب و جوار کے گاؤں اور قصبات میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ فسادات کے دوران بھاگلپور میں ایک واقعہ انتہائی نوعیت کا منفرد تھا۔ فوج نے ایک ہزار افراد کو پولیس کی حفاظت میں دیا اور پولیس کے افراد نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ یہی نہیں پناہ گزینوں کے وہ کیمپ جہاں کچھ زخموں سے چور تڑپتے ہوئے انسان تھے، کچھ بھوک پیاس کے مارے ہوئے انسان تھے بچے اور بوڑھے سسک رہے تھے وہاں ہمارے بھارت کی پولیس کے ان جانبازوں نے حملہ کر کے اپنی جوانمردی اور شجاعت کا ثبوت دیا۔

۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو بابری مسجد کے قریب رام جنم بھومی کے مندر کے افتتاح کے موقع پر جو ریلی نکلی اس کا نعرہ تھا "جو خون نہ کھولے وہ پانی ہے"

ہر غیر جانبدار شخص یہی کہے گا کہ مسلمانوں کے خلاف جس ہندو کا خون نہ کھولے وہ خون نہیں پانی ہے۔

اور اس پر بھی ہمارے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی نے الیکشن مہم کی ابتداء فیض آباد سے کی جو رام جنم بھومی سے متصل ضلع کا صدر مقام ہے۔ اس طرح راجیو گاندھی نے الیکشن جیتنے کے لئے "ہندو کارڈ" کھیلا۔ اس کا ردعمل ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں پر پڑا اور مسلمانوں نے متحد ہو کر شمالی ہندوستان میں کانگریس کو شرمناک شکست دی۔

ان حالات سے موجودہ وزیر اعظم وی پی سنگھ بخوبی واقف ہیں امید ہے کہ وہ سوجھ بوجھ سے کام لے کر اقلیتوں میں اعتماد پیدا کریں گے۔

اقلیتوں کا تحفظ ہی نہیں تحفظ کا احساس اور اطمینان بھی ضروری ہے۔ وی پی سنگھ

کی حکومت کو راجیو گاندھی کی وراثت میں کئی مسائل ملے ہیں۔

پنجاب اور کشمیر میں دہشت گردی کا خاتمہ کرنا ہے۔ بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ حل کرنا ہے۔ نیپال اور ہندوستان کے تعلقات میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا اسے استوار کرنا ہے۔ سری لنکا سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کے بجائے زیادہ سے زیادہ ۳۰ مارچ تک ہندوستانی امن فوج کی واپسی عمل میں لانا ہے۔ اشیاء صرف کی گرانی، آسمانوں کو چھوتی ہوئی مہنگائی، غریبی بے روزگاری، ان تمام مسائل کو حل کرنا وی پی سنگھ کی حکومت کا اولین فرض ہے۔

۱۹۸۹ء میں انقلاب ایران کے بانی امام خمینی کی موت عالم اسلام کیلئے ایک عظیم ناقابل تلافی صدمہ کا سبب بنی۔ پاکستان میں محترمہ بے نظیر کی حکومت کو خطرہ لاحق ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ پانچ سال حکومت نہ کرسکیں اور درمیان ہی میں دوبارہ الیکشن کروانا پڑے۔

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں گذشتہ سال کچھ سدھار ہوا تھا، لیکن ادھر پنجاب اور کشمیر میں دہشت گردوں اور تخریب کاری کے معاملہ کو لے کر تعلقات میں کچھ بگاڑ بھی پیدا ہوا ہے۔

وی پی سنگھ کو اپنے تمام پڑوسی ممالک سے تعلقات استوار کرنا ہوگا۔

الغرض ۱۹۸۹ء ایک سال ہی نہیں بلکہ ایک یادگار ”دہے“ کے آخری سال کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔

۱۹۸۹ء ماضی کو فراموش بناتے ہوئے کہرے دھندلکے میں آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب ہم بیسویں صدی کے آخری دہے کے پہلے سال میں نئی امیدوں کے ساتھ داخل ہو چکے ہیں۔

اللہ کرے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ آمین!

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی۔
ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید احمد شہید کی تفسیر سورۂ فاتحہ اور اس کا اسلوب

حضرت سید احمد شہید (۶/صفر ۱۲۰۱ھ / ۲۸/نومبر ۱۷۸۶ء / ۶/مئی ۱۸۳۱ء) کے نامور سوانح نگاروں اور ان کی تحریک کا جائزہ لینے والوں نے ان کی تصانیف کے ضمن میں کسی اردو رسالے یا کتابچے کا ذکر نہیں کیا ہے (۱) صرف مولانا محمد عبدالحلیم چشتی نے اس اہم موضوع پر اپنے دو مضامین میں روشنی ڈالی ہے اور یہ دونوں مضامین اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ وہ حضرت سید احمد بریلوی کے دو اردو کتابچوں حقیقت الصلوٰۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ کو پہلی بار روشناس خلق کرتے ہیں (۲) تعجب کی بات ہے کہ یہ دونوں رسالے کلکتہ سے ۱۲۴۷ھ میں مولوی بدر علی کے چھاپے خانے میں طبع ہو کر شائع ہو چکے تھے (۳) مگر وہ عام اہل علم کی نگاہ سے اوجھل رہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مولانا چشتی موصوف کے مذکورہ بالا مضامین کو عام طور سے درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا اور غالباً یہی سبب ہے کہ جدید مطبوعات و مضامین میں بھی سید احمد شہید کے ان اردو رسالوں کا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ملتا (۴) سید صاحب کے ان دونوں رسالوں کی زبان و اسلوب کے لحاظ سے بھی اہمیت ہے اور فکر و نظر کے اعتبار سے بھی۔

ایسا نہیں ہے کہ حضرت سید احمد شہید سورۂ فاتحہ یا بعض دوسری سورتوں کے اولین مترجم تھے[۵] یا ان کی تفسیر سب سے قدیم ہے۔ اولیت و سبقت کا شرف تو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کو بھی حاصل نہیں ہے جو عام طور سے ان کے سر باندھا جاتا ہے۔[۶] بلکہ تاریخ کی شہادت تو کسی گمنام بندۂ خدا کے حق میں جاتی ہے جس نے رضائے الٰہی کی خاطر پہلی بار اس برصغیر میں زبانِ عوام اردو / ہندی میں

قرآن کریم یا اسکی سورتوں کا ترجمہ و تفسیر کی تھی ہماری موجودہ معلومات کے مطابق یہ سلسلۂ زریں سرزمین ہند میں پہلے اسلامی قدم کے ساتھ شروع ہوا تھا کیونکہ پیغام الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا اور تشنگانِ علم و معرفت کی طلب بھی یہی تھی۔ کسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ و تفسیر قرآنِ کریم کا پہلا تاریخی ثبوت سنہ ۲۷۰ھ/۸۸۳ء سے متعلق ملتا ہے جب کشمیر کے راجہ مہروک کے لیے ایک گمنام عالم نے ترجمہ و تفسیر کی خدمت انجام دی تھی۔ شہ امکان! اس سے پہلے بھی ترجمہ قرآن ہونے کا ہے مگر اس کے بعد تو ہندوستانی زبان میں تراجم و تفاسیر قرآن کا ایک اٹوٹ سلسلہ نظر آتا ہے۔ محققین نے اٹھارھویں صدی عیسوی سے پہلے کے کم از کم تین مکمل تراجم و تفاسیر اور متعدد جزوی ترجمے تلاش کئے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ و تفسیر سے قبل کے متعدد ترجموں اور تفسیروں کا بھی پتہ چلا ہے اور اب ان کے مخطوطات ملک کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔[شقہ] سید احمد شہید بھی اسی سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ہیں جو اپنے پیشروؤں اور جانشینوں سے زمان و مکان کے دو سروں پر جڑے ہوئے ہیں اور انکے ترجمہ و تفسیر سورۂ فاتحہ کی اہمیت و مقام کا اسی وقت اندازہ ہو سکتا ہے جبکہ فکر و زبان، اسلوب و ادا کے لحاظ سے متقدمین اور متاخرین علماء اور مفسرین کے کام سے اس کا موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سید احمد شہید نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر و ترجمانی غالباً سب سے پہلے سنہ ۱۲۳۴ھ میں لکھنؤ میں بعض جید علماء کرام کی موجودگی میں کی تھی اور اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے اس کی شہادت مولانا محمد اشرف بن نعمت اللہ لکھنوی (متوفی سنہ ۱۲۴۴ھ) نے بھی دی ہے۔[۹] مولانا محمد عبدالحلیم چشتی نے اس ضمن میں حضرت سید شہید کی تفسیر کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "یہ تفسیر اپنی سلاست اور روانی میں شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن کے بعد اردو زبان میں دوسری کوشش ہے۔ جس طرح شاہ دہلوی نے ایجاز سے کام لیا ہے اسی طرح سید شہید نے بھی ایجاز سے کام لیا ہے۔ یہ ترجمہ و تفسیر ریختہ

یا اردوئے معلّیٰ کے بجائے ہندی یا عوامی زبان میں ہے۔" سید شہید نے بول و چال کی زبان استعمال کی ہے اور روزمرہ کو نہیں چھوڑا ہے۔ یہ تفسیر موضوع اور انداز بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو دینی باتوں کے سمجھانے کے لیے عام فہم، سلیس اور ٹھیٹ اردو میں مختصر رسالے لکھنے کی داغ بیل سب سے پہلے سید احمد شہید ہی نے ڈالی تھی جس کو ان کے خلفاء اور مریدان باخلاص نے پروان چڑھایا۔ یہ تفسیر و ترجمہ نہ صرف سید احمد شہید کے انداز بیان و طرز ادا کا پتہ دیتا ہے بلکہ ان پر شاہ عبدالقادر دہلوی کے اثر فکر و زبان و ادا کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اور آخری بات یہ کہ "سید احمد شہید اور ان کے خلفاء نے جہاں اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہے وہاں ان خاصانِ خدا نے اردو زبان کو بھی بڑی ترقی دی ہے۔"[۱۰]

سید احمد شہید نے بسملہ کے بعد سورۂ فاتحہ کی حقیقت سے آغاز کیا ہے[۱۱] اور اس کو دوسرے مفسرین کی مانند طریقِ دعا قرار دیا ہے۔ مگر ان کی تعبیر و تشریح بڑی اچھوتی ہے اور ترجمہ بھی عمدہ غالباً سب سے بہتر ہے۔ مگر یہ دلچسپ اور اہم بات ہے کہ سید شہید نے نہ تو بسملہ کا ترجمہ کیا ہے اور نہ اس کی تشریح و تفسیر کی ہے البتہ حقیقت الصلوٰۃ میں[۱۲] بسملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے: "شروع اللہ کے نام سے جو مہربان ہے رحم والا ہے۔" مگر یہاں بھی اس کی تفسیر و تشریح نہیں فرمائی ہے۔ بسملہ کے بعد وہ آغاز کلام یوں کرتے ہیں:

"اس سورے میں اللہ نے دعا کی طرح بتلائی ہے، اور اللہ کے بتلائے برابر کسی کا بتلایا نہیں ہوتا، اس واسطے یہ سورت بڑی بزرگی رکھتی ہے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ "یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔"[۱۳] شاہ صاحب نے اسی پر اقتصار کیا ہے اور مزید تشریح و تعبیر نہیں فرمائی، جبکہ سید شہید نے اپنی اس تفسیر میں سب سے زیادہ اسی غایت و مقصود پر بحث فرمائی ہے۔ سر سید احمد خاں نے آغاز کلام یوں کیا ہے کہ "اس سورت میں کچھ تو خدا کی تعریف ہے اور کچھ اپنی حا

اور پچھتا — پس گویا بندوں کی زبان سے کہی گئی ہے اور بلا شبہ بندوں کو خدا سے اسی طرح التجا کرنی زیبا ہے۔ "دعا جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے۔" اس کے بعد سرسید مقصدِ دعا اور استجابتِ الٰہی کے مفہوم کی تشریح میں وادیٔ عقل میں چلے گئے ہیں اور ان کی عجیب و غریب تشریح و تفسیر کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے بسملہ کی نحوی اور صرفی بحث چھیڑ دی ہے اور بقیہ سورت کی تفسیر بھی لغوی مباحث سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ "یہ سورت رب العٰلمین نے اپنے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ ان الفاظ میں اپنے خالق و رازق کے سامنے عرض مدعا کیا کریں۔" اور پھر اسی کی مزید تفصیل و تشریح کی ہے۔ معاصر علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور بقیہ تمام مفسرین کرام نے کم و بیش یہی بات کہی ہے۔ لیکن جس خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ سید احمد شہید اس کی ترجمانی و تفسیر کرتے ہیں وہ انھیں کی زبان سے سننے کے لائق ہے:

"اور دعا میں دستور یوں ہے کہ کوئی جانے ہے کہ باوجودیکہ سب آدمی محتاج ہے مقدور والے ہیں پر سوال کرنے میں جو آدمی سخی کریم باہمت اور بامقدور ہوتا ہے اسی سے مانگتے ہیں۔ جتنا تفاوت آدمیوں میں اوصاف سے ہوتا ہے اتنا ہی سوال کرنے میں فرق پڑتا ہے۔ جس میں سخاوت نہ ہو اس سے نہیں مانگتے اور جو سخاوت ہو پر ترش روئی بھی ہو تو اس سے بھی مانگنے میں پرہیز کرتے ہیں۔ اور جو ترش رو بھی نہ ہو بہت خلق ہو پر دینے کے پیچھے ایذا دے جتلا دے منت رکھے اس سے بھی مانگنا اچھے آدمیوں کو سخت بھاری ہوتا ہے۔ اور جو بے مقدور ہو تو اس سے مانگنا نہیں ہوتا ہے۔ اور جتنے یہ اوصاف کمال پر ہوں اتنا مانگنا اس سے خوب ہوتا ہے یہاں تک کہ مانگنا عزت ہو جاتا ہے۔ اور سوال کرنے میں آدمی اول وہ صفتیں اور خوبیاں بیان کرتا ہے کہ جس سے سوال رد نہ ہو۔ اور ایسا کہتا ہے کہ جس سے سوال ہے وہ بھی مان لے اور اقرار کرے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں اور تیرا کہنا سچ ہے

تو بھی دل کے اعتقاد سے کہتا ہے۔ جب یہ سب ہو کر سوال ہوتا ہے تو ہرگز وہ سوال رد نہیں ہوتا بلکہ سوال کرنا واجب ضرور ہو جاتا ہے ایسے سخی کریم سے اور اس سے ملنا بھی ایسا یقین ہوتا ہے جیسا اپنے ہات میں لے لیا۔ جب آدمی کا احوال معلوم کر لے کہ آدمیوں میں ایسا ہو پھر اللہ کی ذات پاک کو کہ جس کی تمثیل نہیں ہو سکتی سمجھے اور مالک، خالق اور مخلوق کا فرق بوجھے کہ جب بندہ مخلوق ایسا ہو تو وہ مالک خالق کس درجے میں ان خوبیوں کے ہے۔ ان خوبیوں کو سچے دل سے سمجھ کر کہے ایسا کہ ادھر سے جواب پا دے سچ یونہی ہے اور تیرا کہنا سچا ٹھیک ہے پھر اس کے پیچھے سوال ضروری ہے اور اس کا رد نہیں ہوتا لابدی قبول ہوتا ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کمال اس سورے میں اپنے بندوں کو تعلیم فرمایا تو کہ حضور دل سے سمجھ کر ایسا کہیں کہ جواب پاویں اور سوال کریں اور ایسی صفتیں اللہ کی بیان کریں کہ دل میں تہ نشین ہو جاوے کہ ایسے اوصاف والے کی درگاہ میں ہرگز سوال رد نہیں ہوتا۔ ان وصفوں میں پہلے الحمد للہ ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام خوبیاں اسی کی ہیں غیر کی نہیں۔ فی الحقیقت وہی ہے خوبیوں والا اس میں سب خوبیاں آ گئیں۔ پھر اس کے پیچھے کئی خاص وصفوں کو بیان کیا کہ جن سے بندے کے دل میں حضوری اور بڑی محبت چمک جاوے۔ اور سوال کی تمہید جیسی چاہیے ویسی ہی دل میں مضبوط ہو۔ یہ اس کو ہے جو سمجھ کر کہے اور جو غفلت کرے وہ اس نعمت سے رہ جاوے۔ حاصل اتنا ہے کہ سوال مانگنا ایسا ہو کہ ضرور قبول ہو جاوے خوبیوں کے بیان کرنے سے اور مالک کے اقرار سے کہ ہاں ایسا ہی ہوں جیسا تو کہتا ہے۔ کیا بڑا کرم اس کا ہے کہ اس نے آپ ہی بندوں کو سکھایا کہ کہیں: الحمد للہ"

سید شہید اس کے بعد حمد والی آیت کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتے ہیں۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں سید بابا قادری بن سید شاہ محمد یوسف قادری نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "تمام تعریف ثابت ہے واسطے اللہ کے۔" شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا ہے: "سب تعریف اللہ کو ہے۔" سرسید نے "سب بڑائیاں خدا ہی کے لیے ہیں" کیا ہے جب کہ ان کے ایک معاصر حکیم محمد شریف خاں (متوفی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) نے یوں ترجمہ کیا ہے: "جو تعریف کہ اول سے

آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے۔" ڈپٹی[۱۹] نذیر احمد کے ترجمہ میں ہے: "ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے۔" معاصر مفسرین میں مولانا اشرف علی تھانوی نے "سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں" کیا ہے۔ جبکہ مولانا دریابادی نے مولانا تھانوی کی کسی قدر پیروی کی ہے اور مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے: "ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔" ان کے علاوہ دوسرے علماء میں مولانا مودودی نے: "تعریف اللہ ہی کے لیے ہے" اور مولانا اصلاحی نے: "شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے" کیا ہے۔ غرض کہ بیشتر مفسرین نے حمد کا ترجمہ تعریف کیا ہے۔ کسی کسی نے ثنا، بڑائی وغیرہ بھی کیا۔ سید احمد شہید نے غالباً سب سے پہلے لفظ حمد کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے ترجمہ کیا: "سب حمد اللہ ہی کو ہے۔" متقدمین اور متاخرین میں بہت کم حضرات نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ گلکرسٹ کی زیر نگرانی علماء کی ایک جماعت نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے لیے جو ترجمہ قرآن ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں کیا تھا اس میں اس کا ترجمہ "ہر ایک حمد خدا کے لیے ہے" کیا گیا ہے[۲۰]۔ مولانا محمد احتشام الدین مرادآبادی نے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں اسی طرح ترجمہ کیا ہے: "حمد کا مستحق فقط اللہ ہے۔"[۲۱]

سید شہید نے پھر حمد کی جو تشریح و تفسیر کی ہے وہ انوکھی ہے، فرماتے ہیں: "حمد کہتے ہیں نیکی اور تعریف خوب کرنے کو۔ مسلمان آدمی جب اس کو کہیں تب چاہیے کہ اس کو تحقیق اسی طور پر سمجھ لیں اور اللہ کے سامنے اس مضمون کو کہ جسے منہ سے مجمل کہا ہے مفصل سمجھیں اور دل میں یقین لا کر اللہ کے حضور اس مفصل کو اپنے اعتقاد موجب اثبات پہونچا دیں، اور اثبات کرنے کی طرح دل میں یہ ہے کہ جس کی تعریف کو خیال کرے سمجھے کہ اللہ ہی کی فی الحقیقت یہ تعریف ہے۔ مثال اس کی جیسا کسی خوبصورت کو جو بڑے درجہ کا خوبصورت ہو دیکھے اور اس کے حسن کی تعریف کرے تو غور کرے کہ اس کی تعریف جو میں کرتا ہوں اس کا حسن اس کے قابو کا نہیں اور اس نے اپنا حسن آپ نہیں کرلیا یہ اللہ نے اپنے کرم سے بنایا۔ وہ اس کا خالق ہے فی الواقع حسن کا مالک وہی ہے اور تعریف اسی کی چاہیے۔ اس آدمی کی تعریف کرنی ایک طرح کی غفلت ہے ہرچند درست ہے۔ اور اسی طور پر حسن کی تعریف کسی چیز پہ ہووے سخاوت پر، یا شجاعت

پر سب میں یہی بات سمجھے کہ اللہ ہی کی یہ چیز ہے تو اللہ کی تعریفوں کا لحاظ کرے کہ بے شمار ہیں اور جس بندے میں کوئی وصف ہے سو وہ اسی کی ایک ادنیٰ بخشش ہے کہ اُس نے اپنے بندے کو ایک تعریف کی چیز دی ہے۔"

تقریباً تمام قدیم و جدید مفسرین نے حمد کی یہی تفسیر و تعبیر کی ہے مگر سید احمد شہید نے زبان سے مجمل تعریف اور دل سے مفصل حمد کا نکتہ اچھوتا پیدا کیا ہے۔ اور دوسرے مفسرین کے یہاں بالعموم نہیں پایا جاتا۔ حسن و کمال اور خوبی کا اصل منبع ذات الٰہی ہے اور باقی ہر چیز جو ان صفات سے متصف ہو حسن مستعار کی حامل ہوتی ہے۔ سید شہید نے اس نکتہ کی عمدہ تشریح کی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی تفسیر کی گونج مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی تفسیروں میں بھی سنائی دیتی ہے[۲۲]۔ رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں سید شہید نے اس آیت کا مختلف ترجمہ کیا ہے جو ہو بہو شاہ عبد القادر دہلوی سے ماخوذ ہے۔ البتہ اس کی تشریح میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

اولین آیت کے دوسرے جز رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ترجمہ سید شہید نے یوں کیا ہے: "پرورش کرنیوالا ہے سارے جہانوں کا" جبکہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے اپنے استاد گرامی کے ترجمہ میں لفظ "ہے" کا اضافہ کر دیا ہے: "جو صاحب سارے جہان کا ہے۔" پہلا ترجمہ یقیناً دوسرے سے بہتر اور الفاظ قرآنی سے زیادہ قریب ہے۔ دوسرے مفسرین نے رب کے لیے پروردگار، مالک، روزی دینے والا، بخشنے والا، پیدا کرنیوالا، پالنے والا، تربیت کرنیوالا، وغیرہ کیا ہے۔ انیسویں صدی کے ایک مفسر حکیم سید محمد حسن امروہی نے غایۃ البرہان میں پرورش کرنیوالا کیا ہے[۲۳]۔ مولانا تھانوی نے مربی ترجمہ کیا ہے جب کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی نے لفظ "رب" ہی کو جنبہ رکھ دیا ہے۔ عالمین کا ترجمہ اکثر قدیم مفسرین نے سارے عالم، سارے جہان، تمام جہان کیا ہے۔ البتہ کچھ حضرات نے سب کا، سب ساری مخلوق کا، ترجمہ کیا ہے۔ مولانا اصلاحی کے یہاں "کائنات"، مولانا مودودی کے ترجمہ میں "تمام کائنات" اور مولانا آزاد کے یہاں "تمام کائنات خلقت" ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا تھانوی نے "ہر ہر عالم" ترجمہ کیا ہے۔

سید احمد شہید کے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ یقیناً بہتر ہے اور اسی طرح ان کی مختصر تشریح بھی دل نشین ہے: فرماتے ہیں:

"سو خدا تعالیٰ کے جو چیز کے عالم میں ہے سب کی پرورش وہی کرتا ہے۔ پرورش کچھ کھانے پینے پر ہی موقوف نہیں۔ کھانا پینا بھی ایک پرورش ہے فرشتوں کی پرورش یہ ہے کہ اللہ ان پر ایسی عنایت فرماتا ہے کہ جس سے ان کا کمال بڑھ جاوے اور خوشی زیادہ حاصل ہو، سو پرورش سے وہ بھی خالی نہیں۔ جیسے کوئی کسی آدمی کو ایسا خوش کرے یا اس پر مہربانی فرمائے کہ وہ آدمی اس کے سبب تازہ فربہ ہو جاوے یہ کھانا دینے سے بہتر ہے اور بڑی پرورش ہے۔ اللہ کی عنایت اسی طور پر ہوتی ہے۔ فرشتوں کی پرورش یونہی کرتا ہے۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا وصف بڑا وصف ہے کیوں کہ وہ پرورش کرتا ہے تمام جہانوں کی کہ جن کا کچھ پایاں نہیں۔ دوست دشمن بھلے برے کو، بھوکوں کو بغیر سوال کے پالتا ہے۔ جو ایسا رب ہو تو وہ البتہ سوال قبول کرتا ہے۔" اس کے بعد فائدہ کے ذیلی عنوان کے تحت فرماتے ہیں: "جب مسلمان اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی تعریف ایسی کرے کہ اسے دل سے سمجھے اور ٹھیک جانے کہ اسی طور پہ ہے اس میں کچھ تفاوت نہیں فی الحقیقت وہ ایسا ہی ہے تو اللہ اس پر متوجہ ہو کر اس کا جواب ارشاد فرماتا ہے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں اور اس بندے کو بھی جتاتا ہے۔ اس جواب پر ہر ایک بندہ اپنے مرتبے کے موافق کلام سنتا ہے یا اسے الہام ہوتا ہے یا دل کو تسکین اور قرار اور خوشی اللہ کے متوجہ ہوتی ہے اور قبول کرنے کی پائی جاتی ہے، حضور دل سے سمجھ کر سوال کرنے کے سبب یہ بات ہوتی ہے اس میں تفاوت نہیں ہوتا۔"

عام طور پر مفسرین نے "عالم گیر ربوبیت الٰہی" کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد نے اس کے نتیجے میں تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ دیکھا ہے جبکہ مولانا مودودی نے مالک و آقا، مربی و پرورش کرنے والا، خبر گیری اور نگہبانی کرنے والا، فرمانروا حاکم اور مدبر و منتظم کے تین معانی بیان کرنے پر اکتفا کی ہے اور مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کے بیان کردہ

پہلے دو معانی پر اسے محصور کر دیا ہے۔ مگر ان مفسرین میں سے کسی نے پرورش کی قسم و نوعیت نہیں بیان کی ہے جیسی سید احمد شہید نے کی ہے۔ ان کا بیان کردہ فائدہ اہل دل اور صوفیانہ خیالات کا مظہر ہے۔

آیت: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا ترجمہ سید احمد شہید نے "بہت رحم والا ہمیشہ رحم کرتا ہے" کیا ہے جب کہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے شاہ عبد القادر کا ترجمہ "بہت مہربان نہایت رحم والا" قبول کر لیا ہے۔ اس کی تشریح میں وہ فرماتے ہیں:

"جو شخص کہ رحم اور پرورش کرتا ہے اور اس سے ہر کوئی وقت بے وقت مانگے تو گھبرا جاتا ہے اور کبھی خفا ہو کر سخت کہنے لگتا ہے اور جھنجھلاتا ہے، اللہ کا ایسا رحم اور ہمیشہ بہت اور ہمیشہ ہے کہ اس کو کبھی کسی کے مانگنے اور پرورش کرنے سے خفگی اور جھنجھلاہٹ نہیں آتی، جتنا کوئی مانگے وہ اتنا ہی خوش ہو، اس لیے اس نے الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فرمایا۔"

دوسرے مفسرین نے مہربان اور نہایت رحم والا اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے کے مصدق و تکمیل کرنے والے ہیں۔ مولانا مودودی نے رحیم کو رحمان کے لفظ سے مبالغہ ادا کرنے میں کمی رہ جانے کی تلافی کرنے والا لفظ قرار دیا ہے۔ مولانا اصلاحی "رحیم" کو تاکید مزید کے لیے لائے جانے کے خیال پر تنقید کرتے ہوئے رحمان کو خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کرنے والا اور رحیم کو رحمت الٰہی کے دوام اور استقلال ثابت کرنے والا لفظ قرار دیتے ہیں۔ سید احمد شہید نے یہی بات عوامی زبان میں تقریباً ڈیڑھ صدی قبل بڑے خوبصورت انداز میں کہی تھی۔

بیشتر مفسرین کی مانند سید احمد شہید نے مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا ترجمہ "مالک ہے جزا کے دن کا" کیا ہے جب کہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے شاہ عبد القادر کا ترجمہ "مالک انصاف کے دن کا" قبول کیا ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ بھی متعدد مترجموں نے اختیار کیا ہے جب کہ متعدد دوسروں نے دین کا ترجمہ قیامت کا دن بھی کیا ہے۔ سر سید نے "حاکم ہے انصاف کے دن کا" اور ڈپٹی نذیر احمد نے "روز جزا کا حاکم" ترجمہ کیا ہے جبکہ معاصر علما میں مولانا تھانوی نے "مالک ہیں روز جزا کے"، مولانا مودودی نے

"روزِ جزا کا مالک ہے" اور مولانا اصلاحی نے جزا کے ساتھ سزا کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا آزاد نے ترجمے سے زیادہ تشریح یوں کی ہے: "جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔"

تفسیر و تشریح کے ضمن میں بیشتر مفسرین نے قیامت کے دن اچھے برے تمام کاموں کا بدلہ دیا جانے کی بات کہی ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "الدِّین کا لفظ جزا کے قانون کا اعتراف ہے اور ... یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔" مولانا مودودی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے "... رحمٰن اور رحیم کہنے کے بعد مالک روزِ جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ نرا مہربان ہی نہیں بلکہ منصف بھی ہے ... لہٰذا ہم اس کی ربوبیت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں، اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور برائی بالکلیہ اسی کے اختیار میں ہے۔" مولانا اصلاحی نے خدا کے اقتدارِ اعلیٰ اور اس کے بلا روک ٹوک نفاذ پر زور دیا ہے۔ سید احمد شہید کی تشریح اس پس منظر میں کافی دلچسپ نظر آتی ہے وہ فرماتے ہیں:

"جزا کا دن قیامت ہے اور اللہ کی مالکیت ہمیشہ ہے: دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مگر ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ دنیا میں بظاہر اور بھی مالک کہلاتے ہیں گو وہ مالکیت عاریت اور ناپائیدار ہے، کیوں کہ اصل مالک اللہ ہی ہے لیکن قیامت میں یہ عاریت کی ملکیت بھی اٹھ جاوے گی۔"

سید شہید نے اس کے بعد کھیتی اور زمینداری، راجہ، نواب اور بادشاہ کے اقتدار ناپائیدار کی مثالوں سے وضاحت کی ہے اور قیامت میں صرف اقتدارِ الٰہی مطلقہ نافذہ کا ذکر کیا ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ کا ترجمہ بیشتر مترجمین نے "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" کیا ہے۔ بعض مترجمین کے یہاں جملے کی ساخت میں فرق ہے مگر تعبیر یہی ہے۔ ان میں مولانا تھانوی، مولانا مودودی، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ شامل ہیں مولانا آزاد اور مولانا

احمدی ان علماء میں سے ہیں جنھوں نے عبادت کی جگہ بندگی استعمال کیا ہے۔ سید احمد شہید نے اس کا ترجمہ: "تجھ ہی کو پوجتے ہیں ہم" کیا ہے جب کہ رسالہ نماز میں انھوں نے شاہ عبدالقادر کا ترجمہ: "تجھی کو ہم بندگی کریں" تھوڑے سے فرق کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اٹھارویں و بیسویں صدی کے بعض مترجموں نے غالباً سید شہید کی پیروی میں لفظ "پوجنا" استعمال کیا ہے۔

بیشتر مفسرین نے اس کی تفسیر میں توحیدِ الٰہی کے اقرار و عمل اور شرک سے گریز و اجتناب کے ان کے اعتراف کو بیان کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اس کے تین مفہوم بیان کیے ہیں جو پوجا اور پرستش، اطاعت و فرمانبرداری اور بندگی و غلامی ہیں اور اس آیت کریمہ میں تینوں بیک وقت مراد ہیں۔ مولانا اصلاحی نے انتہائی خضوع، انتہائی عاجزی و فروتنی کے ساتھ اطاعتِ غیر مشروط کو بھی شامل بتایا ہے۔ سید احمد شہید نے سب سے انوکھی تعبیر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یعنی عبادت تیری اللہ کی ہے۔ عبادت اصل میں تعظیم کا نام ہے۔ تعظیم کی دو طرح ہیں: ایک وہ کہ خاص اللہ نے خاص اپنے واسطے مقرر کی جیسے نماز، روزہ، حج۔ نماز کسی کے لیے نہ پڑھے، روزہ کسی کے واسطے نہ رکھے سوا خدا کے۔ اور جو کوئی سوا خدا کے اور کے واسطے کچھ بھی کرے شرک ہوتا ہے۔ اور اس کے سوا تعظیم کرنی اس کو بھی اللہ کے واسطے ایک طرح خاص جانے کہ اللہ کے حکم سے کرتا ہوں، ماں باپ کی تعظیم اور خدمت سب اللہ کے حکم سے بجا لاوے کہ اللہ کی مرضی ہے، اس واسطے کرتا ہوں۔ اس وجہ سے ساری تعظیم کی صورتیں اللہ ہی کی ہو جاتی ہیں خاص کر۔"

سید شہید کی اس تشریح سے وہ تمام اطاعتیں، تعظیمیں اور فرمانبرداریاں جو دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں یا مخلوقات کی کرتا ہے وہ بھی تعظیمِ الٰہی کے مصداق بن جاتی ہیں کہ وہ حکم و مرضی ربانی سے کی جاتی ہیں بشرطیکہ نیت و ارادہ صحیح ہو۔ یہ تشریح اب تک کسی دوسرے مفسر کے یہاں نہیں مل سکی۔

آیت بالا کے دوسرے جز: **وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** کا ترجمہ زیادہ تر مفسرین نے استعانت، مدد چاہنے یا مانگنے سے کیا۔ مذکورہ بالا تمام مفسرین و مترجمین ان میں

شامل ہیں۔ البتہ مولانا تھانوی نے اس کا ترجمہ "اور آپ ہی سے درخواست عنایت کی کرتے ہیں۔" سید احمد شہید نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "اور تجھی سے اعانت چاہتے ہیں ہم" انھوں نے رسالہ نماز میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ "اور تجھی سے ہم مدد چاہیں" تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ تفسیر میں تقریباً تمام علما و مفسرین نے عبادت و معاملات غرضکہ ہر کاوش انسانی میں اعانت الٰہی چاہی ہے۔ سید احمد شہید نے اسی تفسیر کو اپنے دل نشین انداز میں یوں پیش کیا ہے:

"اعانت کا بھی حال عبادت کا سا ہے۔ ایک اعانت وہ ہے کہ اللہ کے ساتھ خاص ہے جیسے رزق، اولاد، بزرگی مانگنی کسی سے یہ چیزیں مانگنی درست نہیں ہے، اور کسی کے اختیار میں یہ چیزیں نہیں۔ اور ایک اعانت ایسی ہے کہ ظاہر ایک آدمی دوسرے سے چاہتا ہے جیسے پانی مانگنا، کھانا پکوانا۔ اس کو بھی اللہ کے حکم سے جانے تو یہ بھی استعانت اللہ سے ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہم چاہتے ہیں وہ بھی اللہ کی اعانت ہے....."

سید احمد شہید نے اس کے بعد امیر و خدمت گاروں اور بادشاہ اور اس کے غلاموں کی مثال دی ہے کہ ان کی اعانت دراصل امیر و بادشاہ کی اعانت ہے۔ اگر بندہ اپنے مالک کے در سے نہ ہٹے اور اسی کی تعریف کرتا رہے تو مالک اپنے بندے پر فضل بے پایاں کرتا ہے اور اس کے سوال کو کبھی رد نہیں کرتا۔ اور خدائے ذوالجلال اپنے کرم بیکراں سے بندہ کو یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اس سے کیا مانگے اور وہ دعا یہ بتلائی....

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ جس کا ترجمہ سید صاحب نے کیا ہے "بتلا ہم کو راہ سیدھی" جب کہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ "چلا ہم کو راہ سیدھی" اختیار کیا ہے۔ قدیم مفسرین و مترجمین کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ جس نے شاہ صاحب موصوف کا ترجمہ اختیار کیا ہے۔ دوسرے طبقہ نے اِھْدِنَا کا ترجمہ "دکھا" کیا ہے اور تیسرے طبقہ نے "بتا" یا "بتلا" کیا ہے۔[25] جدید و معاصر مفسرین میں مولانا تھانوی اور مولانا مودودی نے "دکھا" ترجمہ کیا ہے جب کہ مولانا آزاد نے پورے فقرہ کا ترجمہ "(خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے" کیا ہے اور مولانا اصلاحی نے "

"ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش" کیا ہے۔ صراط مستقیم کا ترجمہ زیادہ تر "سیدھی راہ" یا "سیدھا راستہ" کیا ہے۔ بعض ترجموں میں "راہ راست" اور "راہ مضبوط" بھی ملتا ہے۔ بیشتر مفسرین نے صراط مستقیم کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ "زندگی کے ہر شعبہ میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا دے جو بالکل صحیح ہو... جس پر چل کر ہم بھی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں۔" الفاظ اور جملوں کا فرق ہے مگر مفہوم سب کا یہی ہے۔ سید احمد شہید نے ان سب سے ہٹ کر یہ تشریح کی ہے:

"صراط مستقیم سے اللہ کی رضا سمجھنا چاہیے، اور چیز اس مقام پر سمجھنی لائق نہیں اس واسطے کہ جو کوئی کچھ مانگے کتنا ہی خوب سے خوب مانگے اللہ کے خزانوں میں ہر چند اس سے بہتر ہو سکتا ہے..... اس واسطے اچھا سوال یہ ہے کہ اس کی رضا مانگے اپنی تجویز نہ کیجیے، اس کی رضا سے جو ہوگا سو خوب ہوگا۔ اور اپنی تجویز بہت بہتر سے بہتر بھی کبھی پشیمانی اور پچھتاوا ہو جاتا ہے..... اس لیے اصل مانگنا اسی کی رضا کا ہے۔ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے اور جو گمان خیال سے باہر ہو وہ بخشتا ہے اور دیتا ہے اور اس کی ذات کا تقاضا یہی ہے اور رضا اس کی بے پایاں ہے..... اور رضا خدائی ہر اچھے کام پر ہوتی ہے۔ اور اچھا کام کبھی بروں سے بھی ہو جاتا ہے جیسے عدالت انصاف کسی بات پر بھی کوئی کافر بھی کرتا ہے اور بعضے کافر محتاجوں کو دیتے ہیں..... ایسی باتوں سے اور کاموں سے اللہ راضی ہوتا ہے پر یہ رضا کچھ کام نہ آوے گی۔ دنیا میں اچھا بدلا دے پر آخرت میں ان کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ جب اللہ کی رضا بعضے اچھے کام کر بروں سے ہوتی ہے ان پر بھی ہو کر تو اس واسطے صراط المستقیم کا بیان بتلایا کر صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ..... راہ ان کی جن پر فضل کیا تو نے۔"

سید صاحب نے حقیقت الصلوٰۃ میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ "راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا" تھوڑے سے تصرف یعنی لفظ "لوگوں" کو ساقط کر کے قبول کیا ہے۔ ابتدائی مترجموں نے فضل، فضل و کرم، نعمت، انعام، اکرام کا لفظ ترجمہ کیا ہے۔ سرسید نے "بخشش کی" ترجمہ کیا جب کہ معاصرین میں مولانا تھانوی، مولانا مودودی اور مولانا آزاد نے

"انعام فرمایا" کیا ترجمہ کیا ہے۔ اور مولانا اصلاحی نے فضل کا لفظ اختیار کیا ہے۔ بیشتر مترجمین نے فضل کو "انعام" کے مترادف یہ ترجمان مانا ہے۔ اس فقرہ کی تشریح مختصر طور سے سید صاحب نے اس طرح کی ہے:

وہ لوگ پیغمبر اور صدیق اور شہید ہیں صالح ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ ہمیں وہ رضا ہمیں دے جو ایسے لوگوں کو دی۔ نہ ویسی رضا کہ جیسے کسی اچھے کام پر جیسے برے لوگوں کو ہو جاتی ہے کہ ان پر غصے بھی ہوتا ہے اگلی بہ جور سے اسی واسطے فرمایا: غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ نہ وے کہ جن پر غصہ کیا.... وَلَا الضَّالِّينَ اور نہ گمراہ...."

رسالہ حقیقۃ الصلوٰۃ میں انھوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "نہ ان کی جن پر غصہ ہوا ہے اور نہ بہکنے والوں کی۔" یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ "نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے" سے قدرے مختلف ہے۔ ابتدائی اور معاصر مفسرین نے عام طور سے ان دونوں فقروں کا ترجمہ غصہ کئے گئے یا غضب کئے گئے اور گمراہ، بہکنے والے ہی کیا ہے۔ بعض لوگوں نے ضالین کا ترجمہ بھٹکے ہوئے کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے یہ ترجمہ کیا ہے "نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے۔" مولانا آزاد کا ترجمہ ہے: "ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔" مولانا مودودی نے "جو معتوب نہیں ہوئے جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں" ترجمہ کیا ہے جب کہ مولانا اصلاحی نے "جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ" ترجمہ کیا ہے۔ سید صاحب اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"جیسے گنہگار فاسق کہ خدا کے غضب میں ہیں ہر چند کوئی کام ان سے اچھا بھی ہو جاوے کہ اللہ کے یہاں مرضی ہو... یعنی کافر ہر چند ان سے بھی کبھی کوئی کام اللہ کی رضامندی کا ہو جاوے پر انکی راہ بھی ہرگز نہیں، لیکن ان کے نصیب میں رضامندی نہیں جو کہ آخرت میں فائدہ دیوے۔"

سید احمد شہید کے اس ترجمہ و تشریح میں دو اہم نکتے ہیں اول یہ کہ وہ شاہ عبدالقادر دہلوی سے متاثر ہیں اور دوم یہ کہ انھوں نے دونوں ناپسندیدہ طبقات کو عام

رکھا ہے جب کہ پسندیدہ اور ہدایت یافتہ طبقات کی نشاندہی کی ہے۔ مولانا تھانوی مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی تشریحات میں سید احمد شہید کے افکار و زبان کی گونج واضح طور سے سنائی دیتی ہے جب کہ دوسرے علماء کے یہاں اس کا اتنا اثر نظر آتا۔ عام طور سے مفسرین نے غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود کو لیا ہے اور الضَّالِّينَ سے نصاریٰ کو۔ مولانا اصلاحی نے ان دونوں کو ان بدبخت طبقات کی واضح مثال قرار دیا ہے۔ مولانا تھانوی مولانا آزاد، مولانا مودودی وغیرہ متعدد علماء نے ان کو عام طبقات رکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت سید احمد شہید کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو میں سب سے پہلی کاوش نہ سہی مگر وہ اولین مطبوعہ تحریر ضرور ہے۔ حضرت کے استاذ گرامی شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی اور انکے برادر مفسر شاہ رفیع الدین دہلوی کی تفسیر کی یکجا پسند ہے کہ اس کو تفسیر کہنا مشکل ہے۔ رسالہ حقیقۃ الصلوٰۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ کے موازنہ سے سید احمد شہید کے فکری ارتقا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ابتداً وہ اپنے استاذ محترم سے نہ صرف متاثر نظر آتے ہیں بلکہ ان کے ہر نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں مگر بعد میں وہ اپنے فکر و تدبر کی روشنی میں ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں۔ اور بہتر طور سے کرتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ سید احمد شہید نے اصلاً یہ تقریر فرمائی تھی اور خود قلمبند نہیں کیا تھا، بلکہ مولانا عبدالحئی صاحب سے تحریر کروائی تھی۔ اپنے قلم سے تحریر کرنے میں زبان و اسلوب کا جو فرق عظیم پڑتا ہے وہ اہل کلم و صاحبان علم سے پوشیدہ نہیں۔ زبان و طرز ادا کے لحاظ سے سید شہید کی زبان میں بعض ناہمواریاں آج ضرور نظر آتی ہیں۔ جملوں کی ساخت میں کہیں کہیں الجھاؤ ہے، اضافت کا موجودہ اصول معدوم ہے۔ صفت موصوف میں تقدیم و تاخیر نظر آتی ہے حرف عطف "اور" کا کثرت سے استعمال ہوا ہے اور جملوں کے آغاز میں ہوا ہے جو بری طرح کھٹکتا ہے۔ بعض متروک الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ بایں ہمہ ان کی زبان اپنی سلاست، روانی اور دل نشینی کے لحاظ سے ادبی کسوٹی پر کھری اترتی ہے۔ زبان کی تمام ناہمواریاں آج کے ترقی یافتہ ادب کے اعتبار سے نظر آتی ہیں ورنہ وہ اپنے عہد کی بہت عمدہ ادبی